محمد حنیف ندوی

اِسلام میں نبوّت کا تصوّر

(۲)

نبوّت و وحی کے معاملہ میں یہ موضوع بہت دلچسپ ہے، اور خاصی تفصیل چاہتا ہے، کہ اس میں حالات و ظروف کے تغیّر کے ساتھ ارتقاء کا عمل جاری رہا ہے، گو یہ حقیقت اپنی جگہ صحیح ہے، کہ جہاں تک مذہب کی بنیادی اُصولوں کا تعلق ہے، ان کو ہر ہر دَور میں یکساں اہمیّت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور اس میں مختلف انبیاء کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف پایا نہیں جاتا۔ لیکن چونکہ ان کا تعلق بہرحال قوموں کی پوری شعوری زندگی کے ساتھ رہا ہے، اس لئے اس زندگی میں جو جو تبدیلیاں اُس وقت کے حالات کی مناسبتوں سے واقع ہوئی ہیں ان کا انعکاس ان کی طرف منسوبہ کتابوں میں برابر محسوس ہوتا ہے۔ اور پھر یہ انعکاس اس درجہ واضح اور نمیز ہے کہ اگر کوئی تھوڑی سی محنت کرے، اور صحفِ انبیاء اور قرآن کو پہلو بہ پہلو رکھ کر تقابلی مطالعہ سے کام لے۔ تو اس عنوان کے تحت اچھی خاصی معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم موٹی موٹی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہیں، جن کو اوّل وھلہ میں ہر قاری معلوم کر دے سکتا ہے۔ سب سے پہلے نفسِ نبوّت کے تصوّر ہی کو لیجئے۔ بائبل میں ایک نبی کا مرتبہ ایک معمولی کاہن اور قبیلوی سربراہ سے اونچا ہرگز نہیں ہے۔ اور اس میں ان اخلاقی بلندیوں کا نشان تک نہیں ملتا ہے جن کو کہ اعلیٰ درجہ کی انسانی صفات سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور جن کی بدولت اُن کی راہیں قومی اور قبیلوی قائدوں اور لیڈروں سے الگ ہوتی ہیں۔ یہی حال اللہ تعالیٰ کا ہے، اس کی سب سے بڑی اور شاندار صفت اس کی رحمت، ربوبیت اور حلم نہیں ہے۔ بلکہ یہ ہے، کہ یہ رب الافواج ہے، دشمنوں اور حریفوں کا قلع قمع کرنے والا، اور ان کو کیفرِ کردار تک پہنچانے والا ہے تعلیمات میں ایک طرح کی سختی، اور قانونیت ہے، زندگی کی لچک اور وسعتیں نہیں۔ پیرایہ بیان اور طریقِ دعوت بھی ایسی نہیں کہ اس میں عقل و فکر کے داعیات کو اُکسایا گیا ہو۔ یا انسان میں مدارج ذہنی کے اعتبار سے جو فرق ہے اس کا خیال رکھا گیا ہو، بلکہ اس میں بھی ایک طرح کا تحکم کارفرما ہے، لہٰذا جو جو تلقین یا مسئلہ پیش کیا گیا ہے، اس میں وہی لب ولہجہ ہے اور وہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جو حکم اور آرڈر کے مزاج کے ساتھ مخصوص ہیں۔ وہ لطافت اور عذوبت بیان نام کو بھی نہیں جو اعلیٰ اور فائق تر وحی کا خاصہ اور حصّہ ہے۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس وقت کی قوموں کی نفسیات ایسی ہی تھیں اور اس دَور میں پورا تمدّن، قبیلوی تعصبات اور گروہی تفریقات کا شکار رہتا۔ ان کا ماحول اسی بات کا مقتضی تھا، کہ ان میں اس انداز کے انبیاء آئیں اور اسی طریقِ تحکم سے ان کی طبعی سرکشی و عناد کو مسخر کریں۔ اور گویہ قبیلہ اور گروہ کے محدود دائرہ ہی میں رہیں۔ تاہم ان کے سامنے سیرت و اخلاق کا ایک نپا تلا انداز ہو جن کی یہ پیروی کریں۔ پھر جب زندگی لب ولہجہ کی سختی اور قانونی ساختوں کی صلابت سے ایک خاص مزاج پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ تو اب ضرورت محسوس ہوئی کہ اس کا ردِّ عمل ظاہر ہو۔

اور تعلیمات اور پیرایہ بیان نسبتاً زیادہ لطیف، زیادہ حکیمانہ، اور تصوف آمیز عناصر لئے ہوئے ہو۔ یہاں ایک نئے دَور یا عیسائیوں کی اصطلاح میں عہدِ جدید کا آغاز ہوتا ہے جس میں حضرت مسیح اور ان کے حواریوں کو سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس دَور نے جذب و اخلاق کے کن کن گوشوں کو متاثر کیا۔ اور زندگی کی کن کن معنویتوں کو اُجاگر کیا، اس کے بارہ میں کوئی دو ٹوک بات کہنا اس لئے مشکل ہے، کہ اس میں بعض تاریخی عوامل اور مجبوریوں سے یونانی فکر اور منیات کی دخل اندازیوں کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ عیسائیت کی بدولت زندگی سے متعلق مذہب کا رویہ زیادہ معقول اور زیادہ روحانی ہوگیا۔ اور انسانیت کو صدیوں کے بعد ان اغلال اور ناقابلِ برداشت پابندیوں سے نجات ملی۔ جس کو یہودیت نے خواہ مخواہ پیدا کر رکھا تھا۔ مگر ابھی ارتقاء کا ایک قدم اور اُٹھنا باقی تھا۔ نبوّت کے تصوّر میں حقیقی اور آخری تبدیلی اس وقت ہوئی، جب اسلام آیا۔ اور قرآن نازل ہُوا۔ یہاں نبوّت کا مفہوم یکسر بدل بدلا۔ اور بجائے کہانت اور پیش گوئی کے اس کے مفہوم میں اعلیٰ درجہ کی اخلاقیت داخل ہوئی۔ اور اس نے تعلق باللہ کی وہ مختتم اور جامع صورت اختیار کی۔ جو ہر ہر انسان کی زندگی کے لئے بہترین اُسوہ اور نمونہ ثابت ہوسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے تصور کو اس انداز میں پیش کیا گیا جس پر کسی بڑے لیڈر کا شبہ نہیں ہوتا۔ بلکہ جو نہایت درجہ لطیف، اور منبع اقدار ہے۔ تعلیمات اور پیرایہ بیان میں یہ رعایت ملحوظ رکھی گئی کہ جس سے ہر ہر نفسیات کا شخص پورا پورا استفادہ کرسکے۔ اس مضمون پر ابنِ تیمیہ اور غزالی کے اُن مضامین کا مطالعہ بہت مفید رہے گا جس میں اُنہوں نے ثابت کیا ہے، کہ قرآن نے ادلہ و براہین اور خطابت و ادب کی اُن تمام نزاکتوں اور رعایتوں کو مرعی رکھا ہے جن سے کوئی انسان متاثر ہوسکتا ہے۔ اور وہ تمام جتن کئے ہیں، کہ جن کی بناء پر کسی دعوت کو کامیابی کے ساتھ دل و دماغ کی گہرائیوں میں اُتارنا ممکن ہے۔ چنانچہ اس میں جہاں منطق کی اُستواریاں ہیں، وہاں فلسفہ و حکمت کی بلند پروازیاں بھی ہیں۔ اور جہاں ادب و شعر کی جاذبیتیں ہیں، وہاں اقوام و ملل کے تجربات حیات کا نچوڑ اور عطر بھی ہے۔ اور آج جب کہ علوم و فنون کے اس دَور میں تمام مذاہب عموماً اپنا بھرم کھو چکے ہیں۔ تنہا اسلام اسی وجہ سے ایک حد تک دعوت اور زندگی کے لائحہ عمل کی حیثیت سے زندہ ہے۔ کہ اس نے ارتقاء و تقدم کے تقاضوں کے مطابق تعلیمات پیش کی ہیں۔ اور کوئی بات ایسی نہیں کہی جس سے موجودہ عصری دواعی متاثر ہوتے ہوں، اور حیاتِ انسانی کے دھارے غلط رُخ اختیار کرتے ہوں۔

اس باب میں اصل مسئلہ یہ ہے، کہ نبوّت کی حقیقت کیا ہے؟ یہ جان لینے کے بعد بھی کہ ایک پیغمبر کی ذہنی و فکری سطح بہت اونچی ہوتی ہے، اور یہ معلوم کر لینے پر بھی کہ جہاں تک تزکیۂ نفس اور رُوح کی تجلیات کا تعلق ہے کوئی دوسرا انسان ان کا مدمقابل تو حریف نہیں ہوسکتا۔ یہ سوال دریافت طلب رہتا ہے کہ اس غیر معمولی ظہور کی فہم و ادراک میں آنے والی توجیہ کیا ہوسکتی ہے؟ اس میں حقیقت ایک پیچ (DELIMMA) ہے جس کے حل پر اس کی عقدہ کشائی موقوف ہے، اور وہ یہ ہے کہ ایک طرف تو عقل و خرد کی فتوحات کا یہ تقاضا ہے، کہ تمام اعلیٰ درجے کے علوم و معارف کا منبع و سرچشمہ اسے قرار دیا جائے۔ کیونکہ تنہا اسی میں یہ خوبی پائی جاتی ہے۔ کہ جہاں یہ گوناگوں اکتشافات فکری کا موجب ہوسکتی ہے، وہاں اس کے مضمرات میں ایسے پیمانے بھی موجود ہیں، کہ جن کی وساطت سے اس کے پیش کردہ نتائج کو پرکھا جا سکتا ہے، اور یہ معلوم کیا جا سکتا ہے، کہ مذہب استدلال نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی

ہے۔ دوسری طرف نبوّت اور اس کی کامیابیاں ہیں۔ اس کا تعلق بظاہر عقل استدلالی سے نہیں ہے بلکہ مخیلہ سے ہے، جو عقل و خرد سے بہر حال فروتر سطح پر فائز ہے۔ اور یا کسی ایسے مرکز سے ہے جس کے بارہ میں انسان کی معلومات افسوسناک حد تک ناکافی ہیں زیدبراں اس کی تعلیمات و دعوت کی اُستواریاں اس ڈھب کی نہیں ہیں کہ عقل و خرد کی رسائیاں پوری طرح ان کا احاطہ کر پائیں، اور صحیح اور غلط کے درمیان کوئی حدِ فارق قائم کر سکیں۔ اس پیچ کو مختلف حکماء نے کیونکر حل کیا ہے؟ اور ان کا یہ حل کس حد تک کامیاب اور قابلِ اطمینان ہے؟ یہی چیز دیکھنے کی ہے۔ ہمیں کہنے دیجیے کہ اس اشکال پر بہت کم لوگوں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔

فارابی کا کہنا ہے، کہ مخیلہ میں جب یہ قوت ہے، کہ یہ خواب در ویا میں کچھ لطیف اشارات و معارف کا ادراک کر سکے، تو اس حقیقت کے باور کر لینے میں کیا دشواری حائل ہے، کہ ایک انسان بیداری میں ترقی یافتہ مخیلہ کی مدد سے عقلِ فعال یا جبریل سے اپنا رابطہ قائم کر لے۔ الفاظ اور مصلحات کے تھوڑے اختلاف کے ساتھ، قریب قریب یہی تشریح غزالی نے کی ہے۔ وہ بھی کہتے ہیں، کہ انسان کو اگر خواب در ؤیا کا کوئی تجربہ نہ ہوتا، تو نبوّت کا ثبوت بہت دشوار ہو جاتا۔

مسلمان حکماء نے تحت الشعور کے اس ظہور کو کیوں بحث آرائی کے لئے چُنا۔ یہ ایک تاریخی بحث ہے۔ سب سے پہلے ارسطو کے دو چھوٹے رسالوں میں ان مسائل کا تذکرہ ملتا ہے۔ انہیں سے مشائیین یونان نے لیا، اور اس نفسیاتی موضوع پر اچھا خاصہ مواد فراہم کر دیا۔ اس کے بعد جب حنین بن اسحٰق نے ان خیالات کو عربی کا جامہ پہنایا۔ تو اس پر بحث و تمحیص کے گویا دروازے کُھل گئے۔ مگر ارسطو کے ہاں کہ خواب میں رمزیت کا کوئی پہلو موجود نہیں۔ معلوم ہوتا ہے، یہ تصوّر جہاں حکماءِ اسلام میں قرآن کی وساطت سے آیا ہے۔ کہ اس نے سورۂ یوسف میں خواب کو ایک تعبیر طلب شئے کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ احادیث سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں بھی رویائے صادقہ کو نبوت کا جز اور حصّہ قرار دیا گیا ہے۔

فارابی، اس اعتراض کا جواب کہ قوتِ مخیلہ درجہ عقل و ادراک سے کم ہے یہ دیتے ہیں، کہ جب دونوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے، اور دونوں ایک ہی ماخذ سے استفادہ کناں ہیں، تو کوئی وجہ نہیں۔ کہ ذرائع کے معمولی اختلاف کو درجہ و مرتبہ کا اختلاف قرار دیا جائے۔ اور ایک کو دوسرے پر مرجح سمجھا جائے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہنا چاہیئے۔ کہ فلسفی اور پیغمبر کے طریقِ علم اور منہاجِ تحقیق میں اختلاف ہے۔ ایک اگر عقل و خرد، اور تجزیہ و استدلال کی مدد سے عقل فعال کے ساتھ ربط پیدا کرتا ہے، تو دوسرا مخیلہ کی غیر معمولی قوتوں کی بدولت اپنا رشتہ قائم کرتا ہے۔

ابنِ خلدون نبوّت کو انسان کا چھٹا حاسہ ٹھہراتا ہے لیکن اس کے باوجود یہ نہیں مانتا کہ اس سے پیغمبر کی ذات میں کوئی حیاتیاتی (BIOLOGICAL) تغیر رونما ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ نے انبیاء کو مفہمین کی اصطلاح سے موسوم کیا ہے اور ان کی کئی قسمیں قرار دی ہیں۔ ان کی پیش کردہ تشریح میں یہ مزے کا نکتہ پایا جاتا ہے، کہ ان کے نزدیک نبوّت صرف اصول کی اصلاح کی ذمہ دار ہے۔ ان کے نقطۂ نظر سے یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ انبیاء جب تک رائج الوقت غلط تصوّرات و مزعومات کی کلیۃً تغلیط نہ کریں، آگے قدم نہ بڑھائیں۔ اور کائنات یا مختلف اقوام و ملل سے متعلق جتنے قصّے اور افسانے مشہور ہیں جب تک ان کو جھٹلا نہ لیں دینیات

کی کوئی بات نہ کریں۔ شاہ صاحب کے ارشادات کا مطلب یہ ہے، کہ انبیاء بسا اوقات ان کی ان مزعومہ غلطیوں کو درست نہیں کرتے اور انہیں کے ضمن میں وہ بات کہہ جاتے ہیں جو بنی نوع کی اخلاقی اور روحانی سربلندی کے لئے ضروری ہے۔ شاہ صاحب کی اس توضیح سے حقیقت نبوت پر براہ راست تو کوئی روشنی نہیں پڑتی مگر یہ بات واضح ہو جاتی ہے، کہ انبیاء علیہم السلام دعوت و تبلیغ کے سلسلہ میں صرف بنیادی اور اساسی چیزوں ہی کا خیال رکھتے ہیں۔ اور باقی جو چیزیں ان کی دعوت میں تاریخ، کائنات اور عقلی، تجربی علوم سے متعلق مذکور ہوتی ہیں، ان کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں، کہ ان کو کسی نہ کسی اخلاقی درس کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں شاہ صاحب نے نہایت معقول عذر بھی بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں، کہ عموماً ان کے مخاطب جو لوگ ہوتے ہیں وہ مشق و مجاہدہ کی اس منزل پر فائز نہیں ہوتے کہ ان مسائل پر غور کر سکیں۔ لہٰذا انبیاء ان کو اس انداز کے غور و فکر کی زحمت بھی نہیں دیتے۔ ان کا مقصود صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ اللہ کے بندے اللہ کو پہچانیں، اپنی زندگیوں کو سنواریں اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھیں۔

شاہ صاحب کے تصور نبوت میں ایک پُرلطف وضاحت یہ بھی پائی جاتی ہے، کہ وہ انبیاء میں ذکاء مفرط کے قائل نہیں۔ بلکہ ان کے ہاں جس طرح جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے انبیاء ایک طرح کے توازن کے مالک ہوتے ہیں اسی طرح عقل و خرد کی حدود میں یہ اعتدال و تناسب کا پیکر محسوس ہوتے ہیں۔ ذکاء مفرط میں ان کے خیال میں یہ قباحت پنہاں ہے، کہ اس طرح یہ کلیات کی سیر اور بلند پروازیوں سے فارغ نہیں ہو پائیں گے۔ اور ان کو یہ موقع ہی میسر نہیں ہوگا، کہ جزئیات کی طرف عنان توجہ کو موڑ سکیں حالانکہ انہیں جزئیات کی اصلاح پر یہ مامور ہیں۔ اسی طرح یہ باطن و روح میں اس طرح محو و مستغرق رہیں گے کہ جسم و ظاہر کی جانب اعتنا نہیں ہو سکے گا۔ لیکن کیا یہ ذکاء مفرط ہے؟ اور کیا ذکاء اور ذہانت کی فراوانیاں اعتدال و توازن کو مستلزم نہیں۔ غالباً شاہ صاحب کی مراد خیال ہے، عقل نہیں۔

نبوت کے بارہ میں اقبال نے جن نظریات کا اظہار کیا ہے، وہ زیادہ پیارے ہیں (اہل فلسفہ سے ہم اس پیرایہ بیان کے لئے معذرت چاہتے ہیں) انہوں نے اس سلسلہ میں تین نکات کی خصوصیت سے نہایت حکیمانہ توجیہ پیش کی ہے:۔

(۱) نبوت اور تصوف میں کیا مابہ الامتیاز ہے

(۲) ختم نبوت سے کیا مراد ہے؟

(۳) قرآن کے الفاظ کن معنوں میں الہامی ہیں۔

جہاں تک نبوت و تصوف میں فرق و امتیاز کا تعلق ہے، اقبال کا کہنا ہے، کہ ایک صوفی تو اتصال و وابستگی کی لذتوں میں کھو جاتا ہے، اور پلٹ کر اس عام رنگ و بو میں آنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن ایک نبی کی اندرونی خواہش ہمیشہ یہ ہوتی ہے، کہ وہ اتصال و قرب کی اس معراج سے پھر لوٹ کر آئے اور انسانیت کے سامنے، تہذیب و تمدن کی نئی نئی راہیں کھولے، دوسرے لفظوں میں صوفی، قلب و باطن کی صیقل گری میں اس لئے مشغول ہوتے ہیں، کہ انوار باطن میں مستغرق رہیں، اور نبی کے تجربات

روحانی اور انکشافات باطنی اس غرض سے ہوتے ہیں۔ کہ وہ ان لذتوں میں دوسروں کو شریک کرے۔ صوفی، اپنی اصلاح اپنے لئے چاہتا ہے۔ اور پیغمبر پورے انسانی معاشرہ کے لئے بہرہ مندیوں کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک نبوت کوئی مافوق الفطرت تقاضا نہیں، بلکہ تقاضائے حیات کی ایک تکمیلی کڑی ہے جس طرح پودے اور شجر میں اپنے نشو ونما کیلئے اپنے اندر فطرت کی طرف سے ودیعت کردہ ایک طرح کی رہنمائی پنہاں رکھتے ہیں۔ اور جس طرح حیوانات کے باطن میں کچھ جبلی تقاضے ہیں، جو ان کی تکمیل کے سلسلہ میں ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح انسان بھی اپنے نشو ونما، اور بقاء وارتقاء کے لئے، قلب وذہن کی تہوں میں کچھ ہدایات محسوس کرتا ہے ـــ اقبال کا کہنا ہے کہ یہ ہدایت وحی ہی کی ایک قسم ہے، جو زندگی کے ان تمام طبقات اور درجوں میں کمیت وکیفیت کے اختلاف کے ساتھ برابر پائی جاتی ہے۔ اور پیغمبر اس انسانِ کامل اور..... دانشور سے تعبیر ہے جو ہدایت کے ان باطنی تقاضوں کو اپنی روشن ضمیری سے دریافت کرلیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نبوت کے صرف ایک پہلو کی تشریح ہے۔ اس پہلو کی جس کا تعلق کہ پیغمبر کی صلاحیتوں سے ہے، اس سے ایک نبی کا جو اللہ سے مخصوص رشتہ اور تعلق ہوتا ہے، اس کی نوعیت پر مطلق روشنی نہیں پڑتی۔ اور باوجود سعی وکوشش کے بھی یہ راز بدستور راز ہی رہتا ہے، کہ ایک محدود انسان کا تعلق ایک غیر محدود ہستی سے کیونکر استوار ہوتا ہے؟ محدود، حدود وقیود کی جکڑبندیوں سے کیسے نیچے اوپر اٹھتا ہے، اور غیر محدود" کن کن تعینات وحدود کو اختیار کرتا ہے۔

ختم نبوت کی توجیہ اقبال کے نقطۂ نظر سے یہ ہے، کہ نبوت کا نظام وحی والہام سراسر ابتدائی انسان اور ابتدائی معاشرہ کی مفصل ہدایت ورہنمائی کے لئے تھا۔ اور اس کی غرض وغایت اس کے سوا اور کچھ نہ تھی کہ انسانی عقل وبصیرت اور خرد ودانش کے دواعی کو بیدار کیا جائے، اور اس کے سامنے، انفس وآفاق میں باقاعدہ غور وفکر کی راہیں کھول دی جائیں۔ پھر جب یہ غرض وغایت باحسن وجہ پوری ہوچکی، اور انسان عقل وادراک کی اُن نعمتوں سے مالامال ہوچکا، تو اب اس نظام کو جاری رکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ یہاں دو باتیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہئیں، ورنہ شدید غلط فہمی کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اقبال کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا، کہ عقل وبصیرت کی بیداری سے مذہب ہمارے اعمال کی اساس اور بنیاد نہیں رہا۔ یا یہ کہ کشف اور متصوفانہ تجربات کے دروازے انسان پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کردئے گئے ہیں۔ اقبال صرف یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ انسان کا عہدِ طفولیت ہزاروں برس پر پھیلا ہوا ہے، اور اس عہد میں، اس انداز کے حالات وظروف قطعی نہیں پیدا ہوئے تھے، کہ جن سے یہ عقل وتجربہ کے بل پر زندگی کے مسائل کو سلجھا سکتا اور اپنے لئے عمل کا مخصوص سانچہ متعین کرسکتا۔ لہٰذا عنایت الٰہی کے سامنے دو ہی راہیں کھلی تھیں۔ یا تو الہام ووحی کے ذریعہ اس کی دستگیری کی جاتی، اور معاشرہ کی تکمیل وارتقاء کا سلسلہ آگے بڑھایا جاتا ـــ اور یا پھر اس کو آزاد چھوڑ دیا جاتا، اور موقع دیا جاتا، کہ خود ان حالات میں عقل وخرد کی روشنی میں زندگی کی حقیقتوں سے بہرہ ور ہو، جب کہ خود عقل وخرد کے تقاضے ہنوز مکمل نہیں ہو پائے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں اور عنایتوں نے پہلا راستہ اختیار کیا، اور انسان کو ایک چکر اور بھنور میں پڑنے سے بچالیا، جس سے عہدہ برآ ہوتا اس کے لئے آسان نہ تھا۔ شخصی اور متصوفانہ تجربات کے دروازوں کو اقبال بند نہیں سمجھتے، ان کا کہنا اس ضمن میں صرف یہ ہے کہ اب کسی شخص کی بات کو اس انداز میں نہیں سنا جائے گا، کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے منصب نبوت پر

سرفراز کیا ہے، بلکہ اب ہر دعویٰ اس بنا پر مانا اور قبول کیا جائے گا کہ عقل و خرد کی کسوٹی پر یہ پورا اُترتا ہے یا نہیں، اور زندگی کی سمتوں کو متعین کرنے میں اس سے کوئی مدد ملتی ہے یا نہیں۔ ہماری رائے میں اقبال کے اس نظریئے میں صرف یہ سقم رہ جاتا ہے، کہ اس سے نبوّت کا مقام عقل و خرد کے مقام سے کچھ فروتر رہتا ہے۔ افسوس ہے کہ اقبال نے مسئلہ کے اس پہلو پر غور نہیں کیا۔

اس وضاحت سے یہ سوال بھی حل ہو جاتا ہے، کہ اجتہاد و رائے کے حدود کس درجہ وسیع ہیں؟ اقبال جب زندگی اور عقل کو صحیح تر پیمانہ اور معیار قرار دیتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہوا، کہ مسائل کے استنباط و استخراج میں ان پیمانوں سے کام لیا جانا چاہیئے۔ اور الفاظ و حروف، اور نصوص و تصریحات پر غور و فکر کرتے وقت اس حقیقت کا مطالعہ بھی کرنا چاہیئے۔ کہ خودحیات و زیست کے دھاروں کا رُخ کس طرف ہے، اور ان کے تقاضے کس نوع کی زندگی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

قرآن کے الفاظ الہامی ہیں یا نہیں۔ اس پر اشاعرہ اور معتزلہ کی صدیوں بحثیں رہیں۔ اشاعرہ کا موقف یہ تھا کہ کلام الٰہی کے مفہوم میں الفاظ و حروف کی ترتیب و ساخت داخل ہے۔ معتزلہ یہ رائے رکھتے تھے۔ کہ اصل کلام معانی سے تعبیر ہے۔ الفاظ و حروف سے نہیں۔ کہ یہ تو محض جنبشِ لب کے رہینِ منت ہیں۔ اقبال نے اس پُرانی نزاع کو یہ کہکر طے کر دیا ہے۔ کہ یہ جھگڑا نفسیات کی تازہ کاریوں سے حل ہو جاتا ہے۔ یہ بات اب علمائے نفسیات نے تسلیم کر لی ہے۔ کہ فکر و خیال جب اوّل اوّل ذہن و دماغ کی سطح پر اُبھرتا ہے، اور اس کا ہیولا فہم و ادراک کی گرفت میں آتا ہے، تو الفاظ و حروف کی منت پذیریوں سے کلیتہً آزاد نہیں ہوتا۔ بلکہ الفاظ و حروف کا لطیف جامہ کسی نہ کسی شکل میں اس مرحلہ پر بھی پایا جاتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس کا احساس نہیں ہو پاتا۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو، تو ذہن انسانی کے لئے مجردات کو سمجھنا محال ہو جائے ـــــ اس طرح گویا اقبال نے اشاعرہ کے موقف کی تائید کی ہے۔

ان تمام نظریات سے جن کو ہم نے بالاجمال ذکر کیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت نبوّت کی ابھی چھان بین ہونا باقی ہے، اور یہ سب نظریات یک طرفہ ہیں، یہ صرف نبوّت کے چند گوشوں کی وضاحت ہی کر پاتے ہیں، نبوّت کے پورے پورے مفہوم کی نہیں۔ فلاطینی کا نظریہ اتصال ہو، یا ابنِ خلدون کا چھٹا حاسّہ اور یک اور غزالی کی رویا، نبوّت میں مماثلت ہو، یا شاہ ولی اللہ کی تفہیم، ان میں کوئی توجیہ بھی ایسی نہیں کہ جو کامل ہو اور اس میں خدشات و وساوس کی قطعی گنجائش نہ ہو۔ اسی طرح علامہ اقبال کی ان حکیمانہ وضاحتوں کے باوجود اس مسئلہ کی تمام تفصیلات نظر و بصر کے سامنے نہیں آپاتیں۔ اور کچھ خلشیں بہرحال ایسی رہ جاتی ہیں کہ جن کا دور ہونا ضروری ہے مگر یہ کب دور ہو پائیں گی، اور انسان کب چہرۂ نبوت کی تابانیوں کا پورا پورا مشاہدہ کر سکے گا؟ اس کے لئے ہمیں اس وقت تک انتظار کرنا چاہیئے، جب تک کہ ہمارے موجودہ فلسفیانہ رجحانات میں بنیادی تبدیلیاں رونما نہیں ہوتیں۔ اور جب تک نفسیات کی تحقیق و تفحص میں خصوصیّت سے مطالعہ باطن کو اس حیثیت سے موضوعِ بحث نہیں بنایا جاتا، کہ اس کی اندر کی تہوں میں ادراک و بصیرت کے وافر خزانے مخفی ہیں، جن کو دریافت کرنا اور کام میں لانا ہے، اور جب تک یہ تعین نہ کیا جائے، کہ ہمارے امیال و عواطف کی زیریں سطحوں میں جنسیت کے علاوہ بھی کچھ محرکات و اسباب ہیں۔ اسی طرح جب تک تصوّف میں فلسفہ کی آمیزش نہیں ہوتی، اور ذہن فکر جدید تر یا تحلیل و تجزیہ کے اصولوں سے آشنا نہیں ہوتا اور فاضل اور ذہین حضرات اس کی طرف مائل نہیں ہوتے کہ جن کی معلومات بھروسے کے لائق

ہوں، اس وقت تک ان کی ریاضتیں اور مجاہدے صحیح علمی نتائج کے حامل نہیں ہو سکتے۔ اور کسی طرح بھی یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ ان کے مکاشفات میں کتنا حصّہ صحیح علم و ادراک کا ہے، اور کتنا حصّہ ذہن و فکر کی فریب خوردگیوں کا۔ ہمارے نزدیک فلسفہ و تصوّف کے رجحانات کے باہم ملاپ کی ضرورت اس بنا پر بھی ہے، کہ دونوں کا وجود ایک دوسرے کے بغیر یکسر ناممکن رہے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تصوّف کے بغیر فلسفہ کو غرض و غایت اور نصب العین کی محرومیاں برداشت کرنا پڑینگی، اور اس کے ارتقاء و تقدم کا کوئی رُخ متعین نہیں ہو سکے گا۔ اور بغیر فلسفہ کے تصوّف کی فتوحات ادھوری رہیں گی۔ یہ صبح سعادت کب طلوع ہوتی ہے؟ اور کن بالغ نظروں کے طفیل یہ عقدہ وا ہوتا ہے؟ بس یہی دیکھنا ہے!

مطبُوعات

بزمِ اقبال

مجلّۂ اقبالؒ۔ مدیر:۔ ایم۔ ایم شریف۔ بشیر احمد ڈار

سہ ماہی اشاعت۔ دو انگریزی اور دو اُردو شماروں میں قیمت سالانہ دس روپے۔ صرف اُردو یا انگریزی شمارے پانچ روپے

		روپیہ آنہ پائی
میٹا فزکس آف پرشیا۔	(انگریزی) مصنفہ علامہ اقبال	۵ — ۰ — ۰
ذکرِ اقبالؒ۔	مصنفہ مولانا عبدالمجید سالکؔ	۵ — ۰ — ۰
اقبالؒ اور مُلاّ۔	مصنفہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم	۰ — ۱۲ — ۰
مکاتیب اقبالؒ۔	بنام خان محمد نیاز الدین خاں مرحوم	۱ — ۴ — ۰
تقاریر یومِ اقبالؒ۔	۱۹۵۴ء	۱ — ۴ — ۰
علاّمہ اقبالؒ۔	مترجمہ صوفی غلام مصطفٰے تبسّم	۱ — ۸ — ۰

ملنے کا پتہ:۔ معتمد بزمِ اقبال و مجلس ترقیِ ادب ۲ نرسنگداس گارڈن۔ کلب روڈ۔ لاہور